

سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کی ادب شناسی -

امیر خسرو ، علامہ اقبال اور . . .

پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض

دار المصنفین اعظم گڑھ کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمن ۱۸ نومبر ۱۹۸۷ء کو ایک حادثے میں راہی عالم بقا ہوئے - عجیب اتفاق ہے کہ ۶۳ برس پہلے اس ادارے کے بانی اور „واقف“ شمس العلماء شبلی نعمانی (۱۸ نومبر ۱۹۱۳ء) کا بھی اسی تاریخ کو انتقال ہوا تھا - سید صباح الدین ، شاہ معین الحق کے جانشین تھے اور دار المصنفین کے چوتھے ناظم - ان کے دور نظامت میں ماہنامہ „معارف“ اپنے معیار کو قائم رکھتے ہوئے بروقت شائع ہوتا رہا - اشاعت کتب کا اہتمام بھی قابل توصیف نظر آتا ہے - مولانا سید صباح الدین تصنیف و تالیف کے کام میں ہی جواں ہمت نہ تھے ، وہ سفر کے لئے بے تردد روانہ ہو جانے کا حوصلہ پیدا کر لیتے تھے - ان کے اس حوصلے سے مجھ ایسے کئی دوسرے پاکستانی ملاقات سے بار بار مشرف ہوتے رہے - چند سال پہلے ان سے یوں ہی بات ہوئی کہ علامہ اقبال کے علامہ سید سلیمان ندوی کے نام لکھے ہوئے خطوط کی اگر نقول مل جائیں ، تو یہ ایک متاع گرانمایہ ہوگی - سید صباح الدین نے کمال مہربانی فرماتے ہوئے شبلی منزل سے مطلوبہ خطوط بھجوا دیئے - سید مرحوم علم و ادب کے شیدائی تھے - چنانچہ ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کی

مناسبت سے کوئی تحریر بھیجنے کے لئے مجھے تہران خط لکھا۔
تعمیل ارشاد میں لکھا جانے والا میرا مقالہ اگست اور ستمبر ۱۹۷۷ء
کے „معارف“ میں درج ہے۔ دسمبر ۱۹۷۷ء میں آپ اقبال صدی کی
تقریبات میں شرکت کرنے پاکستان آئے۔ اس دوران وہ شرکاء اور
مندوبین سے ملے اور واپسی پر ہر ایک کے بارے میں اپنے جو پاکیزہ
تاثرات وہ „معارف“ کے اوراق میں شائع کرواتے رہے، وہ ان کے
اعلیٰ ذوق اور وسعت ظرف پر شاہد ناطق ہیں۔

„دار المصنفین“ کا ہر رفیق اور ناظم علم و تحقیق کے میدان کا
فرد و خید رہا ہے۔ سید صباح الدین بھی معتدبہ مقالوں اور کتابوں کے
مصنف ہیں۔ بزم تیموریہ، بزم صوفیہ اور کئی تراجم اور خطبے ان کی
یادگار ہیں۔ ان کی بعض تحریریں اور تقریریں ابھی ہندوپاکستان
میں شائع ہوں گی۔ سید مرحوم کئی علوم اور زبانیں جانتے تھے۔ میں
ان کے موضوعات میں „ادب“ کی طرف رجوع کرتا ہوں وہ بھی امیر
خسرو اور علامہ اقبال کے بارے میں ایک ایک مبسوط کتاب پر ان کے
تبصروں کی روشنی میں سرسری اور رسمی نوعیت کے تبصرے تو اکثر
لوگ لکھتے ہیں مگر یہ تبصرے ایک نوع کی فہرست نگاری ہوتی
ہے۔ اصل تبصرہ وہ ہے جس میں مبصر کتاب کی روح میں ڈوب کر
بات کرے اور کتاب کے خوب و ناخوب کو پرکھے، مگر جن کتابوں پر
سید صباح الدین ایسے بے بدل عالم کا دل و دماغ متوجہ ہو وہ خال
خال ہی تخلیق ہوتی ہیں۔ لہذا ایسی کتابوں کے نتائج بحث سے
اتفاق ہو یا اختلاف، ان کے مصنفین ایسے تبصروں پر فخر کر سکتے
ہیں۔

خسرو شناسی :

سید صباح الدین نے ماہنامہ „فکرونظر“ کے نومبر اور دسمبر
۱۹۷۸ء کے شماروں میں مشہور ترقی پسند دانشور اور محقق پروفیسر

ممتاز حسین کی کتاب „امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری“ پر ایک مفصل تبصرہ لکھا جسے ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد نے ۱۹۷۹ء کے اوائل میں ۵۰ صفحے کے ایک کتابچے کی صورت میں جداگانہ طور پر بھی شائع کر دیا۔ تقریباً ساڑھے چار سو صفحات (مع اشاریہ ۳۸۰ صفحے) کی یہ کتاب یونیسکو کے زیر اہتمام نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کی۔ امیر خسرو کی تقریبات کی مناسبت سے سرورق پر اکتوبر ۱۹۷۵ء مرقوم ہے مگر کتاب ۱۹۷۶ء میں چھپی۔ دس سال بعد ۱۹۸۶ء میں سعد مطبوعات کراچی نے انگریزی میں ۸۳ صفحات پر مبنی مصنف کا لکھا ہوا اس کا ایک خلاصہ شائع کیا۔ عنوان اس کا بھی „امیر خسرو دہلوی“ ہے۔ ان کتابوں میں نئے تحقیقی دعوؤں سے امیر خسرو کی زندگی کے کئی مسلمات کے بارے میں رد و کد کیا گیا اور ان کی صوفیانہ زندگی اور پاکیزگی سیرت کا برملا انکار کیا گیا ہے۔ سید صباح الدین نے „بزم صوفیہ“ کے مصنف ہونے کا حق ادا کیا اور امیر خسرو کا علمی انداز میں دفاع کیا۔ میں اسے توارف تحقیق ہی کہوں گا کہ ان ہی دنوں بشیر احمد ڈار مرحوم نے امیر خسرو کے صوفی ہونے کی تردید میں ۲۲ صفحے کا ایک مقالہ بربان انگریزی شائع کروایا تھا۔ ڈار مرحوم اپنی اختلاف آمیز تحریریں „خواجہ بدر (۱)“ کے قلمی نام سے شائع کرواتے رہے اور زیر نظر مقالہ سہ ماہی اقبال ریویو بابت اپریل ۱۹۷۶ء میں دیکھا جا سکتا ہے (صفحہ ۱۱ تا ۳۲)۔ „امیر خسرو اور معاصر تصوف“۔ یہ مقالہ تو سید صباح الدین کی نظر سے نہ گذرا البتہ ممتاز حسین صاحب کی کتاب کے مختصر جملے بلکہ الفاظ تک ان کی تیز بین نگاہ کی زد میں آئے۔ مگر اس تبصرے سے حقیقی لطف اندوز ہونے کے لئے کسی قدر خسرو دانی ناگزیر ہے۔ میں اس تبصرے کی حدود و ثغور کے مطابق امیر خسرو کی حیات و تصانیف کا مختصر ذکر کروں

گا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ صاحب شعر العجم کے اس جانشین سوم کی خسرو شناسی کس پائے کی تھی۔

امیر خسرو کے آباء واجداد کا تعلق ماوراء النہر سے تھا۔ ان کے والد سیف الدین چینی منگولوں کی یورش کے دوران برصغیر میں وارد ہوئے اور آگرہ سے متصل ضلع اٹاہ کے موضع پٹیالی میں رہنے لگے جسے مومن پورہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں وہ سلطان شمس الدین ایلتمش (۶۰۰-۶۳۳ھ) کی فوج میں ملازم ہوئے اور امیر عماد الملک کے داماد بنے۔ خسرو ۶۵۱ھ کے کسی روز و ماہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ سات برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ان کی والدہ اور نانا نے کیا۔ بیس برس کی عمر تک وہ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے میں منہمک رہے۔ وہ علوم متداول کے ماہر، شاعر، موسیقی دان اور خوش نویس تھے۔ دور طفلی سے شعر کہنے شروع کر دیئے اور ۱۶ سال کی عمر سے کہے ہوئے ان کے اشعار محفوظ ہیں۔ اپنی ۷۵ سالہ زندگی کے کوئی ۵۵ برس (و ۲۵ھ) وہ معاصر بادشاہوں اور امراء کے ہاں ملک الشعراء کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ وہ حضرت خواجہ نظام الدین چشتی دہلوی (۶۳۳-۶۲۵ھ) کے مرید صادق تھے۔ چونکہ انہوں نے معاصر سیاست میں حصہ نہ لیا، لہذا کسی بادشاہ یا امیر نے ان سے تعرض نہ کیا (۲)۔

امیر خسرو نے نظامی (و ۶۱۰ھ) کی تقلید میں خمسہ لکھا جو مجموعی طور پر دوسرے خمسوں سے برتر ہے: مطلع الانوار، سیرین و خسرو، مجنون و لیلیٰ، آئینہ سکندری اور ہشت بہشت ان کی مثنویوں کے نام ہیں۔ انہوں نے شیخ سعدی کی طرح اپنے دیوان جدا جدا مرتب کئے۔ یہ دیوان شاعر کی عمر کے مختلف ادوار بتاتے ہیں اور ہر ایک کے آغاز میں شاعر نے دلچسپ دیباچہ بھی لکھا ہے: تحفہ الصغر ۱۶ سے ۱۹ سال، وسط الحیاة ۱۹ سے ۲۳ سال، غرة الکمال

۲۳ سے ۲۴ سال ، بقیہ نقیہ ۲۴ سے ۶۶ سال اور نہایۃ الکمال ۶۶ سے ۷۵ سال یعنی آخری نو سالوں کا کلام ہے۔ پہلے چوتھے اور پانچویں دیوانوں کے دیباچے ابھی غیر مطبوعہ تھے اور راقم نے حال ہی میں انہیں شائع کروایا ہے (۳)۔

امیر خسرو کی چند تاریخی کتابیں ہیں : (۱) قران السعدین (سلطان بغرا خان اور اس کے بیٹے معز الدین کیقباد کا صلح نامہ ہے) (۲) مثنوی مفتاح الفتوح (سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی کی چار فتوحات کا ذکر ہے) (۳) مثنوی عشقیہ یا خضر خان و دول رانی (سلطان علاء الدین خلجی کے بیٹے اور سلطان گجرات کی بیٹی کی داستان محبت ہے جسے خسرو نے فرمائش پر لکھا ہے)۔ (۴) مثنوی نہ سپہر ، (سلطان مبارک شاہ خلجی کے عہد کے جاہ و جلال کی روداد پر مشتمل ہے۔ مثنوی نو بحروں میں منقسم ہے اور اس میں فضائل ہند کا بیان بھی ہے سید صباح الدین عبدالرحمن نے اس مثنوی پر ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا)۔ تعلق نامہ امیر خسرو کی آخری مثنوی ہے (مولفہ ۲۵ھ) جو سلطان غیاث الدین تغلق کے نام معنون ہے۔ مندرجہ بالا ۱۵ کتابیں منظوم ہیں۔ ان کے علاوہ خسرو نے تین نثری کتابیں بھی لکھی ہیں اور ان کا حوالہ مولانا سید صباح الدین کے تبصرے میں بھی ہے: (۱) اعجاز خسروی یا رسائل الاعجاز۔ (اس ضخیم کتاب کے پانچ ابواب ہیں اور اس میں ادبی ، عروضی اسالیبی اور نقد شعر کی بحثیں ملتی ہیں) (۲) تاریخ علانی، (سلطان علاء الدین خلجی کے ۱۴ سالہ پورے دور (۶۹۵ - ۷۱۱ھ) کی مختصر مگر مستند تاریخ ہے)۔ (۳) افضل الفوائد اور راحة المحبین۔ (شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں جنہیں پروفیسر ممتاز حسین بے سند و دلیل جعلی قرار دیتے ہیں)۔

امیر خسرو کی مذکورہ بالا ۱۸ کتب انہیں نثر و نظم کی جامع شخصیت ثابت کرتی ہیں اور ان کی اس جامعیت کو علامہ شبلی نے شعر العجم جلد دوم میں نہایت حسن و خوبی سے بیان کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تین لاکھ سے زیادہ شعر کہنا، خاص تعداد اور مقدار میں مثنوی لکھنا، سپاہ گری و دربار داری کے تقاضے پورے کرنا اور صوفیانہ پاکیزہ زندگی گزارنا، سعادت ازلی کے بغیر ممکن نہیں۔

تبصرہ و محاکمہ :

راقم الحروف نے کتاب ۱۹۷۶ء میں پڑھی مگر انتقاد لکھنے کا داعیہ پیدا نہ ہوا۔ مصنف نے چونکہ ابتدائے میں لکھا تھا کہ وہ ۱۹۷۱ء سے خسرو خوانی میں مصروف رہے اور نئی باتیں لکھ رہے ہیں، اس لئے کتاب کا پڑھنا محبان خسرو کیلئے ضروری تھا۔ ایک بزرگ محقق سے بات ہوئی، کہنے لگے کہ ”مصنف نے جو بھی لکھا سو لکھا مگر وہ چیخبرے اور اترائے بہت ہیں“۔ بعد میں جب مولانا سید صباح الدین کا تبصرہ پڑھا تو یہ بات قند مکرر کے طور پر بہتر انداز میں ملی۔ وہ لکھتے ہیں :

”مصنف کی کتاب میں ”منم“ کا اظہار جس فراوانی کے ساتھ کیا گیا، وہ تصنیفی خوش سلیقگی کی دلیل نہیں۔ صیغہ واحد متکلم کا استعمال کسی اچھے اہل قلم کے ہاں کہیں کہیں ملتا ہے لیکن ہمارے مصنف کے یہاں اس کی بہتات ہے اور اگر وہ اپنی کتاب کو بہت غور سے پڑھیں تو کہیں کہیں واحد و جمع کے علاوہ محاوروں، روزمرہ اور جملوں کی ترکیبوں میں بھی ان کو خود غلطیاں نظر آئیں گی۔ وہ بتائیں کہ یہ جملے اور فقرے کہاں تک صحیح اور فصیح ہیں؟ جو..... مشاہیر میں سے ہیں (ص ۶۶) ازروئے انکساری امی لکھا ہے (ص ۱۲۹) یہ بات متحقق ہو سکے (ص ۳۹)

ساری باتیں میں خود ہی محقق کرسکوں (ص ۹۱) حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں بیعت کی (ص ۱۶۰) بمعنی غلام کرے (ص ۶۳) بجز خسرو کرے (ص ۲۵۲) ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے تھے (ص ۲۱۱) ثمرات القدس کا ایک مستند مخطوطہ (ص ۹۷) یہ بتانا ضروری سا معلوم ہوتا ہے (ص ۲۸۶) - حشو و زوائد کی تو بہت سی مثالیں ہیں۔ (ص ۲۸ ، ۲۱) -

ناقد نے مصنف کے ”منم“ پر انتقاد کیا لیکن کس وقار اور تمکنت کے ساتھ ادارہ تحقیقات اسلامی کے سابق ڈائریکٹر نے مولانا سید صباح الدین کے اس علمی اسلوب کو بجا طور پر سراہا ہے۔ :
 ”... مولانا نے مصنف کے اخذ کردہ بعض نتائج کا جائزہ لیا ہے اور بعض خیالات پر تنقید کی ہے، لیکن جیسا کہ پڑھنے کے بعد خود معلوم ہو جائے گا، ان کی تنقید تعمیری اور مثبت ہے اور جو باتیں انہوں نے کہی ہیں، ان کے پیچھے دلائل ہیں۔ ان کی تنقید کی بنیاد تحقیق پر ہے۔ جس بات کو انہوں نے حق سمجھا، اسے برملا کہہ ڈالا۔ تنقید میں ایک علمی سنجیدہ بات کس طرح کہنی چاہیے، اس کا نمونہ مولانا کی اس تحریر میں موجود ہے۔“

پروفیسر ممتاز حسین نے جن تذکرہ نویسوں کا استہزاء کیا ہے، ان میں تذکرہ الشعراء کا مصنف دولت شاہ سمرقندی زیادہ مطعون رہا ہے۔ جامی کا معاصر یہ تذکرہ نویس سنین کے معاملے میں لا پروا تھا اور تحقیق طلب بات کے بارے میں ”گویند“ (لوگ کہتے ہیں) لکھ کر آگے بڑھتا رہا۔ پروفیسر صاحب ”گویند، گویند“ سے بیزار تھے۔ وہ بات تحقیق و تدقیق کے ساتھ کرنے کے مدعی تھے مگر اس کتاب میں کئی جگہ انہوں نے بھی ”گویند“ سے ہی کام چلایا ہے۔ وہ دولت شاہ کو ”افسانہ پرداز اور یاوہ گو“ (ص ۴) کہتے ہیں۔ مگر ہم اس تذکرہ نویس کی ایک ہی بڑی خامی جانتے ہیں جو

سنین سے بے توجہی کے بارے میں ہے۔ اسی سبب سے علامہ شبلی نعمانی نے بھی شعر العجم میں بعض درست سنین کا اندراج نہیں کیا۔ بہر طور، پروفیسر صاحب کی تنقید کی زبان جیسی بھی ہو سید صباح الدین نہایت خوبصورت انداز میں ان کی ”گویند“ والی تحقیق پر محاکمہ کرتے ہیں۔ بحث امیر خسرو کے قبیلے اور ان کے نانا کی راجپوتی نسبت سے متعلق ہے :

”..... خسرو نے کہیں یہ بات نہیں کہی ہے کہ میری ماں یا میرے نانا ہندی الاصل تھے، تو پھر کلیات خسرو کے حسب ذیل اقتباس کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ عماد الملک ایک ہندو راجہ تھے۔

”ر اوت عارض کہ درکار آرائی مملکت ہند ہمہ تن رائے بود چنانکہ اگر خواستی رائے را بگردانید یاد کردے“ (ص ۴۲)۔ اس کا لفظی ترجمہ کرنے کے بجائے مصنف نے اس کی تصریح اس طرح کی ہے کہ :

”کار آرائی مملکت، میں ہمہ تن راجہ اور بہت آسانی سے رائے کو یار بنا لیتے تھے“ (۶۱)۔

مندرجہ بالا فارسی عبارت میں مصنف نے رائے کو راجہ اس لئے قرار دیدیا ہے کہ اسی طرح ان کی مطلب برآری ہوتی تھی مگر ان کے سوا کسی اور کو یہ تصریح قابل قبول نہیں ہو سکتی ہے بلکہ مضحک ہوگی۔ ڈاکٹر وحید مرزا کے سامنے بھی یہ عبارت تھی وہ لکھتے ہیں کہ :

”رائے“ کے حروف کو الٹ دیجیئے، تو یار ہو جاتے ہیں۔ اسی

مناسبت سے ”رائے“ اور ”یار“ کے الفاظ لائے گئے ہیں (ص

۲۹ لاہور ایڈیشن)..... مصنف کی گویند والی تحقیق ملاحظہ

ہو کہ وہ امیر خسرو کے ختائی یا قباچی ترک قبائل میں سے

کسی ایک سے انتساب کو قارئین کے ذوق تحقیق کی ضیافت کی خاطر کھلا چھوڑ دیتے ہیں (ص ۱۲۸) امیر خسرو کے نانا کے ہندوانہ دور کے نام کا اشارہ انہیں اس امیر کے بارے میں مرثیے میں نظر آتا ہے، مگر اس لغز کو بھی وہ حل نہیں کرتے (ص ۱۲۸)۔ سید صباح الدین اسی لئے کہتے ہیں کہ .. یہ بھی تحقیق کی عجیب نوعیت ہے .. (.... ایک تنقیدی جائزہ ص ۳۲)۔

مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن نے اپنے .. ایک تنقیدی جائزہ میں .. امیر خسرو دہلوی، حیات اور شاعری، کی اہم تر غلط اور انحراف آمیز باتوں کا مسکت جواب دیا ہے۔ یہاں اہم تر امور کی طرف اشارے کئے جاتے ہیں :

۱۔ خسرو ایک صوفی صافی اور اعلیٰ سیرت و کردار کے حامل شخص تھے۔

پروفیسر ممتاز حسین نے معاصر تواریخ و تذکروں کے بیانات سے قطع نظر، امیر خسرو کے بعض انکسار آمیز بیانات اور ان کی تشریح و نظم کی دور کی توجیہات اور تاویلات کی مدد سے سیرت خسرو کی وہ تصویر پیش کی ہے جسے نقل کرنے سے بھی کوفت ہوتی ہے۔ سید صباح الدین مرحوم نے خسرو کی اس حیثیت کا محققانہ اور پروقار طریقے سے دفاع کیا ہے۔ اپنے تبصرہ کے آغاز میں ہی انہوں نے لکھا ہے: .. مصنف نے امیر خسرو کی حیات کی ان تمام دل آویزیوں اور رعنائیوں کو زائل کرنے کی کوشش کی ہے جو اب تک لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ ان کی تمام تحقیقی تعبیرات اور ظنیات پر بحث کرنے میں میری یہ تحریر ناظرین کے لئے شاید صبر آزما ہو جائے۔ اس سے ان کی بعض باتوں کی طرف ذہن منتقل کرانے ہی سے پوری کتاب کی نوعیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ امیر خسرو کی زندگی سے لے

کر اب تک تذکرہ نگاروں ، مؤرخوں اور نقادوں میں سے کسی نے ان کی سیرت اور کردار پر وہ حرف گیری نہیں کی ہے جو زیر نظر کتاب کے مصنف نے کی ہے۔ غیر مسلم اہل قلم بھی ان کے اخلاق کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی کے معترف رہے ہیں ، مثلاً ہندوستان کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر تارا چند (ص ۱ ، ۲ تبصرہ) راقم کے نزدیک مولانا صباح الدین ڈاکٹر تارا چند کے بجائے کئی ان غیر مسلم اہل قلم کی شہادت قلم بند کر سکتے تھے جو امیر خسرو کے عہد سے اقرب رہے۔ بہر حال جس امیر خسرو کو لوگ ” فخر الفقراء ، برہان الفضلاء اور امیر الاولیاء “ کہتے رہے (تبصرہ ص ۴) اسے بیسویں صدی عیسوی کے محقق نے ” طماع ہوس زر میں مبتلا ، کاذب اور سیاہ رو “ (تبصرہ ص ۳) بلکہ سیاہ کار ، عاشق مزاج ، عشق باز ، گائیک اور نائیک ، ڈھاری ڈفالی کے جلس، سازندوں کے ہم صحبت ، بدکردار سلاطین کا مدح خواہ ، ابن الوقت اور ستر سال کی عمر تک میں زندگی کی لذتوں کا دلدادہ وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے (تبصرہ ص ۲ تا ۴)۔ مصنف کے نزدیک خسرو کا اصل کام دربار داری تھا۔ خواجہ نظام الدین اولیاء سے ارادت اور صحبت صوفیانہ مظاہر اور ریاکاری تھی۔ وہ امیر خسرو کے قصائد کا حوالہ دیتے ہیں جن میں مدح امراء و سلاطین ہے۔ ان کے نزدیک امیر خسرو اور ان کے معاصر امیر حسن سجزی (۳) دہلوی کے درمیان سخت قسم کی حسد اور رقابت کار فرما رہی ہے۔ امیر خسرو کے دواوین اور منظوم کتب میں قصائد نو ہیں ، بقیہ تحقیقات مصنف کی اختراع ہے۔

امیر خسرو ساتویں/آٹھویں ہجری صدیوں کے تین ربعوں میں زندہ رہے جب سبک عراقی (غزل سرائی) کا رواج تھا ورنہ ساتویں صدی ہجری کے آغاز تک سبک خراسانی (قصیدہ گوئی) کے پیروں نے قصیدہ گوئی میں کونسے مبالغہ و اغراق سے صرف نظر کیا تھا۔ انوری

(و ۵۸۸ھ)، ظہیر (و ۵۹۸ھ) اور خاتانی (و ۵۹۵ھ) کے دواوین قصائد ہی دیکھ لیں۔ ان کے مقابلے میں شیخ سعدی (و ۶۹۰ھ) یا ان کے مقلد امیر خسرو و غیرہم کے قصائد میں مبالغہ آمیز مدح کم ملتی ہے اور اخلاق آموز پند و نصائح زیادہ۔ قصائد کے عیوب بھی ہیں مگر عصری تشہیر کے اس وسیلے نے زبان و بیان کو بے پناہ وسعت اور شکوہ مندی دی ہے۔ امیر خسرو اپنے تیسرے دیوان کے دیباچے میں اسی بنا پر قصیدہ کو غزل سے فائق بتاتے ہیں۔ البتہ نا اہل ممدوحوں کے قصائد لکھنے سے انہیں بھی ایسے ہی خفت لاحق تھی جیسے سرکار انگریزی کی مدح کرنے پر مرزا غالب کو (۵)۔ امیر خسرو بڑے دیندار شخص تھے۔ ان کی نثر و نظم اس بات پر شاہد ہے کہ قرآن مجید، احادیث رسول اور علوم دینی میں وہ کس کس قدر تبحر رکھتے تھے۔ یہ ان کا بڑا کمال ہے کہ وہ کوئی ۵۵ سال امراء و ملوک کی نظر میں محترم رہے اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے اپنی ارادت و عقیدت کو انہوں نے روز افزوں رکھا۔ وہ اپنی ہر کتاب میں مرشد کا ذکر نہایت ارادت سے کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے پنجگانہ دواوین کے دیباچوں کا مطالعہ دلچسپ ہے۔ ان میں سے ہر دیباچے میں ان کی محبت شیخ افزونی کی مظہر ہے۔ جو حضرات مراد و مرید کے ائتلاف و الفت کے منکر ہوں، ان سے کچھ کہنا عبث ہے ورنہ امیر خسرو کی تحریر سے از خود خلوص مترشح ہے۔ دیباچہ دیوان چہارم بقیہ نعتیہ میں ان کے قلم سے شیخ کے اوصاف والقباب ملاحظہ ہوں :

”بز این بندہ آنچه واجب بلکه فرض است ذکر شمائل و فضائل
 شیخ شیوخ العالم است کہ مرا مسکنست آموخت وطنیت بندہ
 از سرشت طیب اوست کہ اخلاقم از دم طیب او مطیب گشته است
 و ہمہ خیرھا پرورده انفاس اوست۔ اوست شیخ شیوخ الاسلام۔“

مقتدی الانام فی الایام صدر صدور العظام واصحاب القلوب، بدر بدور
الکمال بانوار الغیوب، طالب نهج الرضا بما یقله الله، حافظ علی
التتوی فی کل الحال، قامع الهدی، جامع الدنیا والدن، قالع
البدعات والخذعات، رأس الاصفیا فی العصر باوصاف الصفا، مصباح
ظرف الولاية فی ظلم الدنیا بلوامع الولا، حجة الرحمن علی الخلق (۶)
- (الخ) .

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، بشیر احمد ڈار مرحوم نے،، خواجہ بدر،
کے قلمی نام سے ان دنوں (اقبال ریویو اپریل ۱۹۶۶ء) امیر خسرو کے
صوفی ہونے کے رد میں ایک مقالہ تحریر کیا اور شائع کروایا۔ وہ
لکھتے ہیں کہ امیر خسرو، حضرت چراغ دہلوی (و ۷۵۷ھ) کے پائے
کے صوفی نہ تھے۔ وہ سپاہ گر اور دنیا دار قسم کے،، نیک انسان،،
تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کو ان کی موسیقی دانی اور شاعری
سے لگاؤ تھا۔ ڈار مرحوم ایسے ماہر تصوف (۷)، نے اس رائے کا اظہار
اس خاطر کیا کہ مقالے میں مذکور ان کے مآخذ معمولی سے تھے۔ راقم
نے اس کا حوالہ اس خاطر دیا کہ دلچسپی رکھنے والے حضرات اسے
بھی مطالعہ کر لیں۔

۲۔ تحقیقی نکتے :

پروفیسر ممتاز حسین کی کتاب میں کئی تحقیقی نکتے ہیں۔
بعض رطب کھے جائیں گے اور اکثر یابس۔

(۱) امیر خسرو کے والد کا نام محمود تھا یا لاجین؟۔ امیر خسرو
کے دیوان اول تحفة الصغر کے دیباچے کی رو سے ان کا نام لاجین تھا
اور پروفیسر صاحب نے بھی اس پر اصرار کیا ہے (کتاب صفحہ ۵۱)۔

(۲) ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء موسوم بہ،، افضل الفوائد
وراحت المحبین،، کے جامع کیا امیر خسرو ہیں یا کوئی اور نیز کیا یہ
کتاب جعلی ہے؟ پروفیسر صاحب نے اکا دکا دوسرے محققین کی طرح

اس انتساب کو موضوع اور جعلی قرار دیا ہے (کتاب امیر خسرو دہلوی ص ۲۰۷)۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس کے وافر مقدار میں مخطوطے نہیں ملتے۔ مولانا سید صباح الدین نے اس کے انتساب کا دفاع کیا ہے (تبصرہ ۳۸، ۳۹)۔ اگر خواجہ حسن سنجری دہلوی نے اپنے مرشد کے ملفوظات جمع کئے ، تو امیر خسرو کا یہ کام انجام دینا اچنبھے کا موجب کیوں ہو ؟ امیر خسرو کی کتب کے نسبتاً بہت مخطوطے مل جاتے ہیں ورنہ ان کے دور حیات اور اس کے بعد کی صدی میں برصغیر کا بہت کچھ علمی و ادبی سرمایہ تلف ہو گیا۔ جیسا کہ مولانا صباح الدین نے لکھا (تبصرہ ص ۳۳) ان ملفوظات کے جعلی ہونے کے دلائل کی ضرورت ہے۔ ذیل کے اقتباس کی رو سے مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن ۱۹۵۰ء سے اس قبیل کی تحقیق سے منسلک رہے۔ اس سے ان کی کتاب ” بزم صوفیہ “ کے ایک ضمیمہ کا سیاق واضح ہو جاتا ہے :

” ہمارے مصنف نے امیر خسرو کی افضل الفوائد کو ایک جعلی کتاب قرار دیا ہے (ص ۲۰۹) مگر اس سلسلے میں کوئی علمی بحث کرنے کے بجائے صرف اپنا فیصلہ صادر کر کے آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان کی یہ کوئی نئی تحقیق نہیں۔ ایک بہت ہی پرانی بات دہرا دی گئی ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے رسالہ ”مڈیول انڈیا کوارٹرلی“ میں وہاں کے پروفیسر محمد حبیب نے خواجگانِ چشت کے ملفوظات کے بعض مجموعوں کے ساتھ افضل الفوائد کو بھی جعلی قرار دے دیا تھا۔ راقم نے اس کی تردید ”معارف“ میں مضامین لکھے تھے جو اس کی کتاب ” بزم صوفیہ “ کے آخر میں بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ اس جواب سے یہ فائدہ ہوا کہ ان ملفوظات کو قطعی جعلی سمجھنے کے بجائے ان کے مستند یا غیر مستند ہونے پر بحث جاری ہے (دیکھو رسالہ ’منادی کا بابا فرید‘ نمبر

۱۹۷۴ء) افضل الفوائد کے ساتھ۔ راحت المحبین کو بھی امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی نشان دہی جناب محمد سعید احمد مارہروی نے اپنی کتاب امیر خسرو میں یہ لکھ کر کی کہ امیر خسرو نے اس کو افضل الفوائد کے بعد مرتب کیا (حیات خسرو در امیر خسرو مرتبہ شیخ سلیم احمد ص ۲۳۹، تبصرہ ص ۳۸ تا ۴۰) ظاہر ہے کہ سید صباح الدین کا خسرو شناسی ۱۹۵۰ء سے بھی فراتر اور اقدم ہے۔

۳۔ مولانا شہاب ؟ یا مہمرہ ؟

امیر خسرو نے اپنی بعض کتابوں میں اپنے ایک استاد مولانا شہاب الدین کا ذکر کیا ہے۔ مثنوی ہشت بہشت میں جو خمسہ خسرو کا جزو ہے، وہ صراحت کرتے ہیں کہ ان کے اس استاد نے اس مثنوی کی اصلاح کی تھی۔ مولانا شہاب الدین علم و فضل اور شعر میں زبردست دسترس رکھنے کے باوجود کوئی معروف اور شناختہ شخص نہیں۔ اس عصر کے ایک عالم و فاضل شخص جو عظیم شاعر بھی بتائے جاتے ہیں، مولانا شہاب الدین مہمرہ تھے جنہیں بدایونی لکھا جاتا رہا ہے۔ مہمرہ کی نسبت مجہول ہے اور اس عالم شاعر کے حالات بھی بہت کم معلوم ہیں۔ ان کا کلام بھی تھوڑا ہی دستیاب ہے۔ تاہم وہ امیر خسرو کی توصیفات سے ابعد نہیں بلکہ قریب تر ہیں۔ سید صباح الدین لکھتے ہیں (تبصرہ ص ۴۰) کہ اگر شہاب الدین کا عصر زندگی واضح ہو سکے تو وہ امیر خسرو کے استاد قرار پاسکتے ہیں، مگر پروفیسر ممتاز حسین کو اس نسبت سے بلاوجہ انکار ہے (ان کی کتاب ص ۳۷) قرائن تاریخی سے معلوم ہوتا ہے کہ مہمرہ، امیر خسرو سے عمر میں اتنے بڑے تھے کہ وہ ان کے استاد مانے جا سکتے ہیں۔ ۶۳۳ھ میں بقول ملا عبدالقادر بدایونی (منتخب التواریخ) مہمرہ نے سلطان رکن الدین فیروز شاہ کا قصیدہ

لکھا تھا۔ یہ بادشاہ مذکورہ سال کے صرف دس ماہ حکمران رہا تھا۔ امیر خسرو اس واقعہ کے ۱۸ سال بعد پیدا ہوئے۔ ۷۰۱ھ میں انھوں نے ہشت بہشت کی اصلاح کی۔ خسرو نے اس مثنوی کو نظامی کی مثنوی ہفت پیکر کے جواب میں لکھا اور اس کے ۳۳۵۰ شعر ہیں۔ بہر حال مولانا شہاب الدین مہمرہ اگر ۷۰۱ھ یا اس سے چند سال بعد تک زندہ رہے ہوں، تو وہ خسرو کے عصر سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان کی عمر ۱۰۰ کے لگ بھگ ہو سکتی ہے (۸) (اس عصر میں امیر خسرو کے نانا تو ۱۱۲ برس کی عمر میں فوت ہوئے تھے)۔

۳۔ تحقیقی شتر گربگی :

ہر کام میں نیت اہم ہوتی ہے۔ فرمودہ رسول ہے : انما الاعمال بالنیات۔ امیر خسرو دہلوی، نام کی کتاب کے مصنف کے مقاصد و اہداف جدت و تجدد پر مبنی تھے۔ اس لئے ان کی کتاب میں توصیف و تنقیص اور تمدیح و تنقید کی عجیب شتر گربگی نظر آتی ہے۔ وہ کہیں کہیں امیر خسرو کی تعریف کر گئے، مگر دوسری جگہ اس کی تلافی کر لی۔ مولانا سید صباح الدین ان کی طنز کو،، سفاکانہ،، قرار دیتے ہیں (ص ۲۲، ۲۳) وہ خسرو کے کلام کو عارفانہ بھی مانتے ہیں مگر اسے عاشقانہ اور فاسقانہ بھی قرار دیتے ہیں (کتاب ص ۱۱۱)۔ وہ امیر حسن سجزی دہلوی کے بھی خلاف ہیں اور امیر خسرو کے بارے میں معاصرین کی آراء سے اغماض کر کے متاخرین کے مطالب نقل کر دیتے ہیں مولانا سید صباح الدین لکھتے ہیں کہ مصنف نے اس بات سے کوئی تاثر نہیں لیا کہ،، امیر خسرو اپنی ساری تصنیفی زندگی کے دوران حضرت خواجہ نظام الدین سے بیعت رہے۔ وہ دربار اور خانقاہ میں بیک وقت وارد ہوئے۔ مولانا ضیاء الدین برنی (و ۷۷۷ھ) صاحب تاریخ فیروز شاہی، دہلی میں بستی نظام الدین میں ہی مدفون ہیں۔ انھوں نے امیر خسرو، خواجہ حسن اور خود

اپنی دوستی کا ذکر نہایت دلاویزی سے کیا ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین نے ان معاصر روایات کو درخور اعتنا نہیں جانا۔ وہ امیر خسرو کے حاصل کردہ انعام و اکرام کی غلط تاریخیں لکھتے اور ان سے بڑھ کر غلط نتیجہ گیری کرتے ہیں۔ یہ طویل تبصرہ از اول تا آخر خواندنی ہے۔ خسرو شناسی کے اعتبار سے اس موقر حصار تحریر میں بظاہر کوئی نمایاں رخنہ ڈالنا مشکل ہوگا۔ ہم اس کا اختتامیہ نقل کر کے اپنی گزارش کو ختم کر رہے ہیں۔ اس اختتامیہ میں علامہ اقبال کے دو شعر نقل کئے گئے، ایک ارمغان حجاز سے ان کی دوبیتی کا ہے اور دوسرا ان کی پہلی مثنوی اسرار خودی کا۔ البتہ مولانا سید صباح الدین نے توجہ نہیں فرمائی کہ دوسرے شعر کو، اقبال کے تین دوسرے شعروں کے ساتھ، مصنف نے ”خسرو، اقبال کی نظر میں“ کے عنوان سے کتاب کے شروع میں درج کر دیا ہے مگر اس سلسلے میں غالب کا شعر ہی عقدہ کشائی کرے گا :

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

مصنف کے انگریزی کتابچے ”امیر خسرو دہلوی“ (سعد پبلی کیشنز کراچی ۱۹۸۶ء) سے معلوم ہوا کہ وہ ماشاء اللہ اب اقبال پر بھی ایک کتاب لکھ رہے ہیں :

لالہ این چمن آلودہ رنگ است ہنوز

پسر از دست مینداز کہ جنگ است ہنوز
(اقبال)

اب مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن رحمۃ اللہ کے ”تبصرے“ کا اختتامیہ ملاحظہ ہو :

..ہمارے مصنف کو امیر خسرو کے عشقیہ اشعار میں گوشت و پوست کے محبوب کا عشق اور سراپا ہی نظر آتا ہے۔ ان کے وجدان

میں کسی کو کیا دخل ہے مگر علامہ محمد اقبال کو خسرو کے عشق میں عشق الہی ہی نظر آیا اور خداوند تعالیٰ سے خسرو ہی کے ایسا سوز عطا کرنے کے لیے دعا بھی مانگی ۔

عطا کن ، شور رومی، سوز خسرو

عطا کن صدق و اخلاص سنائی

علامہ محمد اقبال نے خسرو کو رومی اور سنائی ہی کی صف میں لاکھڑا کیا ہے اور خسرو کا وہ سوز وہی ہے جس کے متعلق ہمارے مصنف کے قلم سے خدا جانے یہ کیسے نکل گیا ہے کہ معلوم نہیں وہ کونسی آگ تھی جو ان کے یعنی خسرو کے دل کو چھو گئی اور وہ ساری عمر اس آگ میں جلتے رہے ، تب ہی تو شیخ نظام الدین اس ترک جگر دار کے سوز دل کے صلہ میں اپنی مغفرت کی دعا مانگا کرتے ، (ص ۳۳۶) اور اگر ہمارے مصنف اقبال کے ساتھ خسرو کا گہرا مطالعہ کریں تو ان کو پتہ چلے گا کہ اقبال نے خسرو کے تخیل عشق سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ تب ہی وہ سوز خسرو کے طلب گار ہونے میں .. خسرو کے ہاں بھی عشق و عقل کی وہی جنگ ہے جو اقبال کے یہاں ہے۔ خسرو عشق کی سلطانی کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، عقل سے کوئی مصالحت نہیں کرتے۔ اقبال نے آخر میں عقل (۹) سے مصالحت کر لی ہے۔ پھر خسرو کے یہاں انسان کامل کا وہی تصور ہے جو اقبال کے یہاں ہے۔ خود مصنف کو بھی اعتراف ہے کہ خسرو انسان کو اس کے مقام کبریائی سے آشنا کرتے ہیں۔ وہ اس کو بتاتے رہے ہیں کہ تو اس اضافت کو کیوں فراموش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کے پتلے میں اپنی روح پھونکی (ص ۳۸۳)۔

مصنف کی ابھی بہت سی باتوں کی طرف توجہ دلانی جا سکتی ہے مگر یہ تبصرہ اور بھی طویل ہو جائے گا۔ اس کو پڑھ کر ہمارے ناظرین مصنف کتاب کا مطالعہ کر کے خود فیصلہ کریں کہ اس

میں امیر خسرو کی کیسی تصویر پیش کی گئی ہے۔ کیا اس کے ذریعہ خسرویات کے لٹریچر میں مفید اضافہ ہوا ہے اور کیا تحقیق کے فن میں اس کی وجہ سے وزن اور وقار بڑھا ہے؟ آخر میں یہ کہنا ہے کہ کوئی امیر خسرو کی کتنی ہی عیب جوئی کرے، ان کے مداح مولانا ضیاء احمد برنی کے اس بیان میں تھوڑی ہی ترمیم کر کے محفوظ ہوتے رہیں گے کہ خدا کی قسم اس نیلے آسمان کے نیچے ان کے جیسا کوئی ہے یا کہ نہیں یا کوئی تھا یا نہیں یا کوئی ہوگا کہ نہیں۔ اور ہاں، مولانا شبلیؒ کی اس رائے سے خسرو شناس لذت لیں گے کہ „ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات پیدا نہیں ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف جامع ایران کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کئے ہوں گے،“ اور علامہ محمد اقبال نے امیر خسرو سے متعلق جو اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ۔

فطرتش روشن مثال آفتاب گشت از بہر سفارت انتخاب

اس کو ہمارے مصنف ذرا غور سے پڑھیں اور سوچیں کہ انہوں نے امیر خسرو کی تصویر کس رنگ میں پیش کی ہے۔ آزادی رائے کے اس دور میں مصنف کو حق تھا کہ خسرو کے متعلق جو چاہیں لکھیں مگر ان کی کتاب کی نوعیت اس حیثیت سے بدل جاتی ہے کہ یہ نیشنل کمیٹی برائے سات سو سالہ تقریبات امیر خسرو کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ اگر یہ کتاب اس کی طرف سے شائع نہ ہوتی تو اتنا طویل تبصرہ بھی نہ لکھا جاتا۔

یاد آتا ہے کہ جب اسلام آباد میں ۱۹۷۵ء میں خسرو کے جشن کی سات سو سالہ قومی اور بین الاقوامی تقریبات منائی گئیں تو ان میں امیر خسرو کے متعلق بعض مندوبین نے کچھ ایسی باتیں کہیں جن کو سن کر اس ملک کے مشہور طنز نگار ابن انشاء نے لکھا تھا

کہ امیر خسرو نے سات سو سال میں جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کو اس قومی اور بین الاقوامی سیمینار میں چھین لینے کی کوشش کی گئی۔ امیر خسرو پر کسی کتاب کے لکھنے اور اس کو شائع کرنے میں اس طنز کا لحاظ رکھنا ضروری ہے،، (تبصرہ ص ۲۸ تا ۵۰)۔ اس عبارت کو پڑھ کر فرخی سیتانی (و ۱۳۲۹ھ) کا ایک شعر یاد آ رہا ہے کہ :

ہر ستر گز کہ با علم و فضل گشت بزرگ

نشود خرد بہ بد گفتن فلاں و بہمان

یعنی جسے علم و فضل کے ذریعے عظمت ملی ہو، وہ فلاں اور بہمان (وغیرہ وغیرہ) کی برائی سے بے وقعت اور چھوٹا نہیں ہو جائے گا۔ اقبال شناسی،، زندہ رود پر تبصرہ :،

،، زندہ رود، علامہ اقبال کا افلاکی نام ہے جس سے وہ ،، جاوید نامہ،، میں موسوم رہے ہیں۔ علامہ کے فرزند عزیز ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نے اس عنوان سے ان کے احوال و آثار و افکار قلم بند کئے ہیں۔ مصنف مدتوں اس کتاب کا مسالہ جمع کرتے رہے۔ انہیں اس ضمن میں خصوصی مراعات اور سہولتیں بھی حاصل تھیں جس سے انہوں نے استفادہ کیا۔ کتاب تین جلدوں میں مکمل ہوئی۔ اس کا فارسی ترجمہ چار جلدوں میں چھپا۔ سید صباح الدین نے تینوں جلدوں پر جداگانہ تبصرے کا التزام کیا کیونکہ ہر جلد دوسری سے چند سالہ وقفے کے بعد شائع ہوئی ہے۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز نے ۱۹۷۹ء میں پہلی جلد جو شائع کی اس پر سید مرحوم کا تبصرہ جولائی ۱۹۸۰ء کے شہ ماہی اقبال ریویو میں شائع ہوا۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل یہ تبصرہ (ص ۹۵ تا ۱۱۱) کتاب کے اہم مطالب کا خوب ترجمان ہے۔ یہ جلد اقبال کے تشکیلی دور پر مشتمل ہے (ابتدا تا ۱۹۰۸ء) دوسری جلد وسطی دور کی حاکی ہے (۱۹۲۵ء) جبکہ

آخری تیسری جلد جو ضخیم تر ہے ۱۹۲۵ء تا ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء تک کے شاعر اسلام کی فکری اور عملی روئداد پیش کرتی ہے۔

سید صباح الدین اقبال شناس ہونے کے علاوہ اقبال کے ارادت مند بھی تھے۔ لہذا مصنف سے وہ کیا تعرض کرتے۔ یہاں امیر خسرو کی سی کیفیت تھی ہی نہیں کہ انہیں کسی مغرضانہ تصنیف سے رد و کد کا واسطہ پڑتا۔ جلد اول پر تبصرے کے آخر میں انہوں نے لکھا:-

”ممکن ہے کہ لکھنو اور دہلی کی زبان کے جویاؤں کو اس کتاب میں زبان کی کچھ خامیاں نظر آئیں۔ اس کے مصنف کے والد بزرگوار کی شاعری میں ایسے لوگوں کو زبان کی کمزوریاں نظر آتی تھیں مگر انہوں نے یہ کہہ کر ان کی زبان بند کی تھی :

اقبال لکھنو سے نہ دلی سے ہے غرض

ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اس کتاب کی زبان کے ناقدین کو ڈاکٹر جاوید اقبال بھی یہی کہہ سکتے ہیں۔ اس تقریظ کو پڑھتے وقت بعض قارئین کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس میں صرف مدح و ستائش کے ہار گوندھے گئے ہیں، تنقیص کی کہیں چنگاریاں نہیں ہیں۔ مگر یہ راقم اس کا کیا کرے کہ اس کو علامہ اقبال سے عشق ہے۔ جب ان کی کہانی ان کے لائق فرزند کی زبانی بیان ہوئی تو اس میں اس راقم کو وہی لذت ملی جو کسی رند بلا نوش کو شیشہ و ساغر کی محفل میں مئے دو آتشہ اور سہ آتشہ کے دور میں ملتی ہے ع

جو عشق جانگداز ہو تو عشق باز کیا کریں

سید صباح الدین کا اظہار ارادت بجا مگر ”زندہ رود“ مجموعی طور پر ایک اعلیٰ پایے کی کتاب ہے۔ اس کی جلد اول پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد نے ۱۹۸۱ء میں مصنف کو دس ہزار روپے کا انعام دیا تھا۔ بعد میں ۱۹۸۸ء میں وزارت تعلیم نے پوری کتاب پر ۳۰ ہزار روپے کا انعام دیا۔

علامہ اقبال تسلسل حیات اور خودی کے استدام کا موضوع بیان کرنے کے لئے ندی اور دریا کی روانی کا استعارہ بار بار استعمال کرتے رہے۔ ”جوئے آب“ اگر دریائے رواں سے نہ مل سکے اور خشک زمین کو سیراب کرتے کرتے جذب ہو کر رہ جائے تو یہ بات ان کے تصور بیخودی سے مطابقت رکھتی ہے کہ ”فرد“ معاشرے کے کام آیا۔ زبور عجم میں ہے۔

اے خوش آن جوئے تنک مایہ کہ از ذوق خودی

در دل دریا فرو رفت و بدریا نرسید

ترجمہ : وہ کم آب ندی مبارک ہے جو ذوق خودی سے خاک میں جذب ہو گئی اور دریا (سمندر) تک نہ پہنچی۔

اس نقطہ نظر سے ان کا نام ”زندہ رود“ بڑا معنی خیز ہے۔ جاوید نامہ میں وہ اس سے خاطر خواہ استفادہ کرتے ہیں۔ رومی کہتے ہیں کہ اقبال کے مستعار نام ”زندہ رود“ کی اساس اس شاعر کا سرعت اندیشہ اور بے نیازی ہے :

تند سیر اندر فراخائے وجود من زشوخۂ گویم اورا زندہ رود
(فلک عطارد)

مرد بے پروا و نامش زندہ رود مستی او از تماشائے وجود
(فلک مریخ)

سلطان شہید ٹیپو ایک مقام پر ”دریائے کاویری“ کو پیغام دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ”زندہ رود“ ہونے کی بنا پر اس صاحب پیغام شاعر اور ان کے دار الحکومت سرنگا پٹم سے گذرنے والے اس دریا میں خوش آئند معنوی ربط ہے۔

در جہاں او زندہ رود تو زندہ رود خوشترک آید سرود اندر سرود
دوسری طرف دریائے زیست کی روانی اقبال کے اردو ساقی نامہ (بال جبریل) کے آغاز میں زیادہ شدومد کے ساتھ مذکور ہے اور ان اشعار

کی بازگشت مولانا سید صباح الدین کے تبصرہ زندہ رود (جلد اول) میں منعکس ہے ۔

وہ جوئے کہستان اچکتی ہوئی اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
 اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
 رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
 ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

ان منتشر اشارات کے بعد اب ,, زندہ رود ,, جلد اول پر تقریط کا آغاز دیکھیں اور مولانا سید صباح الدین کی موثر ادبیت پر سر دھنیں ,, علامہ محمد اقبال کی جاوید نامہ میں جو مختلف کردار ہیں، ان میں ایک زندہ رود بھی ہے جو خود علامہ ہیں ۔ ان کی اس سوانح حیات کا یہ نام رکھ کر ان کے لائق فرزند نے ان ہی کی طرح اپنی جدت ذہن کا ثبوت دیا ہے ۔ ,, زندہ رود ,, کے معنی مسلسل بہتی ہوئی حیات آفریں ندی بتائے گئے ہیں جس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اچکتی، اٹکتی، لچکتی، سرکتی، اچھلتی، پھسلتی اور بڑے پیچ کھا کر پہاڑوں کو چیرتے ہوئے بہتی ہے ۔ ,, زندہ رود ,, پڑھ کر یہ اثر قائم ہوا کہ اس کی تحریر اچکتی، اٹکتی، مچلتی، اچھلتی، سنبھلتی اور بڑے پیچ کھا کر کر تاریخی، سیاسی اور معاشرتی واقعات کے تودوں کو چیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ,, (اقبال ریویو مذکورہ تاریخ کا شماره صفحہ ۹۵ ، ۹۶) ۔

زندہ رود کی جلد اول پر زیادہ تبصرہ استحسانی اور توصیفی نوعیت کا ہے ۔ مولانا سید صباح الدین نے کتاب کے اہم نکات کو مزید آشکار کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ایسے تبصرے اصل کتاب کے ساتھ ساتھ مطالعہ کرنے میں مفید ہیں ، مثلاً :

,, ان کے بعض اشعار سے یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فلسفہ ایسے علوم پر ان کے عبور کا سبب ان کا برہمن نسب

ہونا تھا مگر انہوں نے فلسفے کو خود ہی دینی رہبری کی خاطر ناکافی پا کر مسترد کر دیا۔ ان کے تجربے میں تو عشق رسول ایسی نعمت ہے جس کے ذریعے وہ اپنے تمام فکری مسائل کو حل کر سکتے تھے۔ اس لئے قرآنی تعلیمات سے ان کا شغف اسلام کے ساتھ ان کی محبت اور مسلمان ہونے پر ان کا فخر وہ فطری عناصر تھے جس سے ان کی شخصیت کی تشکیل ہوئی، ” (ص ۱۶) یہ ایسا جامع اور پر مغز تبصرہ ہے جس سے اس شاعر اسلام کے افکار کو صحیح طور پر سمجھنے میں پوری مدد ملے گی اور یہ ان کی ذات اور ان کے کلام کا ایک معرف شخص ہی کر سکتا ہے۔“ (اقبال ریویو ص ۹۹، ۱۰۰)

اقبال کے قیام یورپ کے ”زندہ رود“ میں ذکر کے بارے میں تبصرہ کا یہ اظہار نظر کتنا دلاویز ہے: ”علامہ جب یورپ روانہ ہوئے ہیں، تو اس کی تفصیل کتاب کے چھٹے باب میں آ گئی ہے اور جب وہ کیمبرج، ہائٹڈل برگ اور میونخ وغیرہ میں قیام کرتے ہیں تو اس کی کہانی کتاب کے آخری یعنی ساتویں باب میں ہے۔ ان تمام تفصیلات کو لکھنے میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا قلم ایک افسانہ نویس اور ناول نگار کے قلم میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کو پڑھتے وقت وہی لطف ملتا ہے جو کسی اچھے ناول نگار کی تحریر میں ملا کرتا ہے۔ ان دونوں ابواب کی بہت سی باتیں اقبال کے اور سوانح نگاروں کی تحریروں میں نہیں ملیں گی اور اگر ہوں گی بھی تو ان کے پیش کرنے کا وہ رومانی اور کیف آگیاں انداز نہیں جو اس کتاب میں ہے،“ (ص ۱۰۸)۔

مولانا سید صباح الدین کی اقبال شناسی کہیں کہیں کتاب کے بعد کے ابواب کی پیشن گوئی کر گئی اور ایسے موقع پر وہ اقبال کے اشعار کی نثر میں ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک مثال پر اکتفا ہوگا :

،،وہ اس وجودی تصوف سے بیزار ہو گئے جس کی حکمت ملکوتی اور علم لاهوتی میں حرم کے درد کا درمان نہیں اور جس کی تعلیم میں ذکر نسیم شبی، مراقبہ اور سرور ہیں مگر اس سے دل یا نگاہ مسلمان نہیں بنی۔ یا اس وجودی فلسفے سے بے رغبتی ظاہر کی جس سے اسلاف کا جذب دروں حاصل ہوتا ہو نہ جس سے زمرہ لایحزنون میں شریک ہونے کی تڑپ پیدا ہوتی ہو۔ جس میں خرد کی گتھیاں سلجھا کر صاحب جنون ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہو یا جس میں مئے ،، لا الہ الا ہو ،، پی کر من و تو کی تفریق مٹ جاتی ہو یا جس سے وہ فقر حاصل ہوتا ہے جس کے ہزاروں مقام میں روح قرآنی بے پردہ نظر آتی ہے۔ یہ وہ بحث ہے جو ممکن ہے کہ اس کتاب کی دوسری جلد میں پڑھنے کو ملے ،، (اقبال ریویو ص ۱۰۹ ، ۱۱۰)۔

اقتباس بالا میں مبصر نے ضرب کلیم اور بال جبریل کے بالترتیب مندرجہ ذیل اشعار کا نثری روپ اور ان کی تحلیل لفظی پیش کی ہے۔

یہ حکمت ملکوتی ، یہ علم لاهوتی
حرم کے درد کا درمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نسیم شبی ، ترے یہ مراقبہ یہ سرور
تری خودی کے نگہیاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں (۱۰)

عطا اسلاف کا ذوق جنوں کر
شریک زمرہ ،، لا یحزنون ،، کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا ، مجھے صاحب جنوں کر

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو

پلا کے مجھے منے لا الہ الا ہو (۱۱)

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے

وہ فقر جس میں بے پردہ ہے روح قرآنی (۱۲)

جلد دوم :

زندہ رود جلد اول پر تبصرہ ، اقبال ریویو میں شائع ہونے سے قبل ماہنامہ „ معارف “ بابت جون ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ جلد دوم پر ان دونوں مجلوں میں یک زمان شائع ہوا (جنوری ۱۹۸۲ء)۔ „ اقبال ریویو “ کی طویل تقطیع میں یہ ۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ „ زندہ رود “ جلد دوم ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

اس تقریظ میں اہم اور مفصل علمی اور سیاسی بحثیں در آئی ہیں۔ ہم یہاں چند امور کی طرف اشارہ ہی کر سکیں گے۔ تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ مبصر ۳۳ - ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اعلیٰ جماعتوں کے طالب علم تھے (اقبال ریویو ص ۹۶) ابتداء میں وہ لکھتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر تبصرہ نہیں ایک مستقل مقالہ لکھ رہے ہیں کیونکہ کتاب کی اہمیت اس کی متقاضی ہے۔ „ راقم اس طرح اپنے کا وہ کائنات اور اپنے قلم کے چھلاوہ پن کے لئے معذرت خواہ ہے “ (ص ۹۶)۔ کتاب کے مطالب کی تحلیل پیش کرنے کے علاوہ مبصر کی بعض ضمنیات خواندنی ہیں۔ مسئلہ وحدت الوجود ، اسلام کا نظام حکمرانی ، جمہوریت یا ملوکیت، اقبال کی اردو اور انگریزی نثری تحریریں (۱۹۰۸ - ۱۹۲۵ء)، معرکہ خودی ، اقبال کا تصور عشق اور اقبال کی اشتراکیت اور سرمایہ داری کی مخالفت اس ضمن کے چند عنوانات ہیں۔ مولانا سید صباح الدین لکھتے ہیں کہ وحدت الوجود کی ایک توجینہ کے اقبال خلاف تھے ورنہ ان کا تصور عشق آخر الامر وحدت وجود کا ہی ترجمان نظر آتا

ہے۔ پھر بڑے بڑے ثقہ صوفیہ اور علماء اس تصور کے قائل رہے ہیں۔ وہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی رائے سے استمداد کرتے ہیں کہ قرآن مجید اور احادیث رسولؐ میں ملوک کا ذکر ہے اور اسلامی مدنیت نے اب تک ملوک کو یہاں اور وہاں برداشت کر رکھا ہے۔ ایران کے نامور دانشور ڈاکٹر سید حسین نصر بھی ہم سے یہی کہا کرتے تھے۔ اقبال بہر حال یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کی روح ایک روحانی جمہوریت اور نظام شورائی کی متقاضی ہے۔ اس موضوع پر کافی لکھا بھی جا چکا ہے۔ اس جلد کی تقریظ میں مبصر نے مصنف پر کچھ لفظی گرفت بھی کی ہے۔ ”علما کی موقع پرستی“ اور ”صوفیہ کی شعبہ بازی“ (زندہ رود جلد ۲ ص ۱۸۲) کے الفاظ ان کے خیال میں ایسی متین کتاب میں نہیں لانے چاہئیں۔ اسی طرح نثر و نظم سے کام لینے کو لوگوں نے ”تخلیق“ کہنا شروع کر دیا جو ایک ملحدانہ تصور ہے۔ ”تخلیق“ خالق کا کام ہے دوسرے تو خدا داد صلاحیت سے مطالب کی ترتیب نو ہی کرتے ہیں۔ (ص ۱۱۲)۔ امور سیاست میں اقبال کے موقف کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے :

”ڈاکٹر صاحب عملی سیاست میں تو زیادہ پیش پیش نہیں رہے، لیکن وہ ہر سیاسی معاملے میں اپنی خاص رائے رکھتے تھے۔ مثلاً وہ خلافت عثمانیہ کا کوئی مستقبل نہیں دیکھ رہے تھے۔ اس کی بجائے وہ برٹش کامن ویلتھ کی طرح مسلم کامن ویلتھ چاہتے تھے۔ ان کی زندگی میں یہ خواب پورا نہ ہو سکا مگر آج کل اسلامی ممالک کے سربراہوں کی اجتماعی کوشش میں اس خواب کی تعبیر نظر آتی ہے۔ مسئلہ خلافت پر ہندوؤں کے ساتھ مل کر عدم تعاون کی تحریک میں مسلمانوں کی شرکت کے خلاف رہے اس لئے کہ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں ایسے اشتراک اور مسلمانوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر قومیت متحدہ کے داعی ان کی علیحدہ ملی حیثیت کو ختم نہ کر دیں“ (ص ۱۲۹)۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں مولانا شبلی نعمانی نے علامہ اقبال کو پھولوں کا ہار پہنایا اور انہیں ”ترجمان حقیقت“ کا لقب دیا تھا۔ اس موقع پر بڑی فکر انگیز تقاریر ہوئیں اور قوم نے جوان سال شاعر اور مصنف سے ایسی توقعات وابستہ کی تھیں جن سے وہ غالباً زیادہ فائق نکلے۔ پاکستان میں یہ روئداد گذشتہ دہے سے معروف رہی، مگر دار المصنفین والوں کو، بشمول مولانا سید صباح الدین، اس کا علم پہلی بار ”زندہ رود“ جلد دوم سے ہوا۔

بھارت کے مسلمان بظاہر ابھی دو قومی نظریے کی افادیت کا احاطہ نہیں کر سکے۔ علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح نے برصغیر کے ماحول میں اس نظریے کو جس طرح پیش کیا، وہ ایک حقیقت ہے اور یہاں ایک سے زیادہ مسلم ریاستیں قائم ہو جانے یا ہمارے داخلی تنازعات سے اس نظریے کی نفی نہیں ہوتی۔ ”جواب شکوہ“ میں ہے ع

نشہ مر کو تعلق نہیں پیمانے سے (۱۲)

بہر حال سید مرحوم کے سے الفاظ ہم نے اوروں سے بھی سنے، اس لئے انہیں نقل کر دیتے ہیں :

”البتہ مسلم قومیت کی جو ترویج ڈاکٹر صاحب نے کی تھی، ان کے زمانے میں ضرور ابھری اور پاکستان کی تحریک اور اس کے قیام پر ختم ہو گئی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہ مسلم قومیت مشرق بنگال میں بوڑھی گنگا اور برہم پتر میں جا کر غرقاب ہوئی اور ہندو میں غول بیابانی بن کر منڈلا رہی ہے۔ بلوچستان کی پہاڑیوں سے بھی ٹکرا رہی ہے اور سرحد کی سرزمین

میں خاک آلود ہو رہی ہے۔ (ص ۱۱۰)۔ مگر اس قسم کے یاس انگیز تاثرات سے روح اقبال گویا یوں مخاطب ہے کہ
 کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
 ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
 جلد سوم :

،،زندہ رود،، جلد سوم ۱۹۲۶ تا ۱۹۳۸ء حیات اقبال کو محیط ہے۔ کمیت کے اعتبار سے یہ پہلی دونوں جلدوں کے لگ بھگ ہے اور کیفیت کا اندازہ اس کے محتویات سے کیا جا سکتا ہے۔ البتہ سید صباح الدین کا اس پر تبصرہ بالنسبہ مختصر ہے۔ جون ۱۹۸۶ء کے ،،اقبالیات،، (سابق اقبال ریویو) میں ۲۸ صفحے اس تقریظ یا تبصرہ کے لئے مخصوص ہیں۔ (ص ۱۵۵، ۱۷۳)۔ ابتداء میں تقریظ نگار نکتہ آفریں بن کر حضرت علامہ اور ان کے صاحبزادے کے نادر فضائل گناتے ہیں :

،،، انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں جو ارباب کمال مسلمانوں کی زندگی کے معمار بنے ان میں سے کسی کے فرزند ارجمند کو اپنے والد بزرگوار کی سوانح عمری لکھنے کی سعادت اور توفیق نہیں ہوئی۔ علامہ محمد اقبال اس لحاظ سے خوش نصیب باپ ہیں کہ ان کے لائق فرزند نے سوانح عمری لکھ کر نہ صرف ان کی روح کو خوش کیا بلکہ ان کی ملت کو ایک بیش بہا اور دل نواز تحفہ پیش کیا۔ یہ وہی جاوید اقبال ہیں جن کو مخاطب کر کے ان کے والد بزرگوار نے کہا تھا۔

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
 سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
 میں شاخ خاک ہوں مری غزل ہے مرا ثمر
 مرے ثمر سے مٹے لالہ فام پیدا کر

یہ تینوں جلدیں لکھ کر اس کے مصنف نے دل فطرت شناس کا ثبوت دیا ہے اور اپنے والد بزرگوار کی زندگی کے سکوت لالہ و گل سے ہم کلام ہو کر اور ان کے خیالات کی شاخ اور ان کے افکار کی غزل کے ثمر سے مٹے لالہ فام (۱۳) پیدا کر دیا ہے۔ (اقبالیات ص ۱۵۵)۔

تقریظ نویس ۱۹۲۶ تا ۱۹۳۸ء میں دور شباب میں تھے اور اس زمانے کے واقعات کے ناظر۔ ان کا ادبی ذوق کس قدر جالب ہے کہ وہ کتاب کے اسلوب کے بارے میں بجا فرماتے ہیں کہ :،، یہ مصنف کی بہت کم سنی کا زمانہ تھا لیکن اس کے لکھنے میں ان کا انداز آنکھوں دیکھا حال کا سا ہے۔ یہ ان کی محنت اور تحریر کی خوبی ہے۔ (ص ۱۵۶)۔ اس سے چند سطر پیشتر انہوں نے لکھا تھا :،، پہلی اور دوسری جلدوں کی طرح اس کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی مثنوی پڑھ رہے ہیں جس میں اس کا ہیرو کبھی سیاست کے میدان عمل میں دکھائی دیتا ہے کبھی بچوں کا شفیق باپ نظر آتا ہے اور کبھی اس کا دل کون و مکان کے راز مضمحل کو فاش کر کے ایک ابدی پیغام چھوڑنے کے لئے متفکر ہے۔ ان تمام باتوں کو قلم بند کرنے میں لائق مصنف نے کبھی اپنی بذلہ سنجی، کبھی طرز ادا کی خوش سلیقگی، کبھی تحریر کی شگفتگی کا وہی انداز اختیار کیا جو ان کے والد بزرگوار نے اپنے بارے میں کہا تھا،، کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ،، (۱۵)

سید مرحوم نے تصور و قیام پاکستان کی بات مصلحتاً مختصر کی۔ وہ مصنف سے خر سند ہیں کہ انہوں نے سیاست پاکستان کی خوب قلعی کھولی ہے مگر قیام پاکستان کے خونچکان واقعات انہوں نے بالاجمال ہی لکھے ہیں۔ اس جلد میں مذکور سیاسی واقعات کے عنوانات کا خلاصہ انہوں نے یوں لکھا ہے :

،،عبدالرشید کے ہاتھوں سوامی شردھانند کا قتل ، شددھی اور سنگھٹن کے جواب میں مسلمانوں کی تبلیغ اور تنظیم، جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا جھگڑا بمبئی سے سندھ کو الگ کرنے (کو سمجھانا)، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دستوری اصلاحات کا نفاذ، پنجاب اور بنگال کی کونسلوں میں مسلم اکثریت کی بحالی ، مرکزی اسمبلی میں مسلم نمائندوں کے تناسب کا مطالبہ، کشمیر کی آزادی کی تحریک، ، رنگیلا رسول، کے مصنف کا قتل ، سائمن کمیشن کی آمد پر تعاون اور عدم تعاون کا سوال، آل پارٹیز کانفرنس کی تجاویز، نہرو رپورٹ، محمد علی جناح کے چودہ نکات، گول میز کانفرنس ، شاردابل ، احمدی تحریک کے خلاف شورش، مسلم لیگ کی دھڑابندی ، مولانا محمد علی کی وفات، محمد علی جناح کی بددلی اقبال کا اسلامی ریاست کا تصور ... ” (ص ۱۵۷) تقریظ نگار کی یہ رائے قابل لحاظ ہے کہ ،، زندہ رود “ میں اقبال کے سفروں کی روئدادیں اگر علیحدہ کر کے شائع کر دی جائیں تو اسفار اقبال کی ایک دلچسپ کتاب بن سکتی ہے (ص ۱۵۹) - ابدیت اقبال کا بیان مولانا مرحوم کی زبان میں یوں بیان ہوا ہے :

،،یہ ابدیت ... بانگ درا کے ہر شعر میں محفوظ ہے “ اسرار خودی اور رموز بیخودی کے جریدے میں اس کا دوام ثبت ہے - پیام مشرق کی سطروں میں اس کو پیغام بقا مل چکا ہے - یہ زبور عجم کی ہواؤں میں ہمیشہ سنائی دے گا - جاوید نامہ میں زندہ جاوید رہے گا ، بال جبریل کے نغموں میں سرمدی رہے گا ، اس کی ضرب کلیم کے ذریعے اس کا ہنگامہ خاموش برپا رہے گا - ارمغان حجاز سے اس کے افکار کا ارمغان حاصل ہوتا رہے گا “ (ص ۱۵۹) - تصانیف اقبال کا یہ ذکر پڑھ کر علامہ سید سلیمان ندوی کا نثری مرثیہ ،،اقبال“ یاد آتا ہے جو مئی ۱۹۳۸ء کے ماہنامہ ،، معارف “ میں شائع ہوا اور کئی کتب

میں نقل ہوتا رہا ہے۔ چند جملے یہ تھے : ” اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا ، اس کے جان حزن کی ہر آواز زبور عجم ، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اور اس کے شعر کا ہر پر پرواز ” بال جبریل ” تھا “ ۔

بہر حال ، سید مرحوم ایک چابکدست ادب شناس تھے ۔ قارئین ان کی عبارت کا حسن ملاحظہ کر سکتے ہیں ۔ اسی آخری اقتباس کو دیکھیں ۔ ” جریدے میں اس کا دوام ثبت ہے “ اس حصے میں مثلاً حافظ شیرازی کے درج ذیل شعر کی طرف اشارہ ہے ۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد ز عشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

تقریظ کے آخر میں مبصر نے علامہ اقبال کے تفکر کے ان پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق فلسفہ ، الہیات ، علم کلام اور عام علوم اسلامیہ سے ہے ۔ انہوں نے علامہ مرحوم کے سات انگریزی خطبات کا لب لباب پیش کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کی مساعی اور اہلیت کو خاص طور پر سراہا ہے ۔ زندہ رود بلا شک ایک معروضی، دلاویز اور اعلیٰ تحقیقی کتاب ہے مگر مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن کا یہ تبصرہ بھی ایک جداگانہ کتابچے کی صورت میں شائع کئے جانے کا متقاضی ہے ۔

مولانا ماهر القادری کی نثر و نظم :

سید صباح الدین کی ادبی تحریریں دیکھتے دیکھتے ماہنامہ ، فاران کے ماهر القادری نمبر (دسمبر ۱۹۷۸ء) پر نظر پڑی جس میں ان کا ۱۳ صفحے کا ایک مضمون درج ہے (۲۷ تا ۲۸) اس کا عنوان ہے ماهر القادری ، ایک باغ و بہار شخصیت ، راقم ماهر مرحوم کا معاشر اور نیاز مند رہا اور ان کی اکثر کتابیں اور تحریریں اس کے تصاحب میں ہیں مگر سید صباح الدین کے جامع تاثر سے تعجب ہوا ۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم ہر موضوع پر ممکنہ مواد جمع کر کے قلم اٹھاتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ہر موضوع کا حق ادا کیا ہے۔ اپنے اس تاثراتی مضمون میں انہوں نے ماہر کی نثر و نظم، ان کے سفروں اور ان کے دیگر اوصاف کے بارے میں خوب نکتہ آفرینی کی ہے۔ یہ مضمون „یاد رفتگان“ کے مصنف کے شایان شان ہے۔ اس کے ذریعے کوئی سلیقے کا انشائیہ لکھنا سیکھ سکتا ہے۔

ابتداء میں اس بات کا ذکر ہے کہ مضمون نویس اور ماہر القادری (اصل نام منظور حسین ۱۹۰۶ء تا ۱۹۷۸ء) ۱۹۳۵ء سے پہلے کے ایک دوسرے کے متعارف تھے اور ۱۹۷۵ء کے بعد کراچی وغیرہ میں اکثر ملتے رہے۔ ماہر زبان درست لکھنے اور بولنے پر بہت زور دیتے۔ وہ بدعات اور عجمی تصوف کے خلاف تھے۔ وہ ایک جہاں دیدہ شخص تھے۔ اندرون برصغیر کے علاوہ انہوں نے شرق و غرب کے اکثر ممالک میں گزر کیا۔ البتہ حرمین شرفین کی غیر معمولی محبت نے انہیں بطحا میں ہی پیوند خاک کر دیا۔ ان کے کئی افسانے اور ناول شائع ہوئے۔ ان کے چار مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے جن میں ایک

„فردوس“ کے نام سے موسوم ہے۔ „ظہور قدسی“ کا نام انہوں نے مولانا شبلی کی سیرت النبی سے مستعار لے کر ۹۰ ابیات کی حامل ایک نعت لکھی۔ یہ نعت اور ان کا „سلام“ بے حد معروف اور ایمان کی حلاوت سے لبریز ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں وہ بھارت سے ہجرت کر کے کراچی آ گئے اور یہاں سے ماہنامہ „فاران“ نکالا جو بڑی باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ اس کے توحید اور سیرت نمبر کتب حوالہ کا مقام رکھتے ہیں۔ „نقش اول“ کے علاوہ „یاد رفتگان“ اور „ہماری نظر میں“ (تبصرے) اس کے مستقل عنوان تھے۔ ماہر القادری، علامہ اقبال کے ارادت مند تھے۔ اقبال پر ان کی کئی نظمیں ہیں۔ ایک نظم کا انتخاب مولانا سید صباح الدین کے تعارف کے ساتھ

ملاحظہ ہو : ,, اقبال کے بہت معترف تھے - کہتے کہ میر کی شاعری آہ ہے سودا کی واہ تو اقبال کی شمع راہ ہے - رومی نے مسلمان کو ولی اللہ بنانے کی کوشش کی تو اقبال نے کافر کو مسلمان بنایا - اقبال کی وفات پر انہوں نے ایک غم ناک نظم بھی لکھی تھی جس کے چند اشعار یہ ہیں -

کارواں خواب میں تھا ,, بانگ درا، سے پہلے
ساز میں سوز بھی تھا تیری نوا سے پہلے
اللہ اللہ ترا قافلہ نطق و کلام
,, بال جبریل ,, کے سایہ میں ہوا گرم خرام
صرف مشرق ہی نہیں مغرب کو بھی پیغام دینے
نگہ و فکر پر ,, اسرار خودی، فاش کینے
تو کبھی شعلہ رقصاں، کبھی رفتار نسیم
موج کوثر ترے اشعار کہیں ,, ضرب کلیم،
ترے شعروں میں کہیں معرکہ بدر و حنین
کہیں ایمان براہیم، کہیں عزم حسینؑ
اس لئے ہے تری ایک ایک بات مجھے قبول
ترا سرمایہ دانش تھا فقط عشق رسول
محفل رومی و عطار تھی مدت سے خموش
ترے نغموں نے بنایا اسے ہنگامہ جوش

(فاران دسمبر ۱۹۷۸ء، صفحہ ۲۷۸)

سید مرحوم نے بجا لکھا ہے کہ ,, فاران، میں مندرج ماہر القادری کے مضمون کتابی صورت میں شائع ہوں خصوصاً اس رسالے کا عظیم ,, سیرت نمبر - وہ لکھتے ہیں : ,, ان کا سفر نامہ ,, کارواں حجاز، ان کے تمام دینی خیالات کا کشکول ہے، (ص ۳۸۵) - اس کے بارے میں مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن کی چند سطور اور ماہر

القادری مرحوم کے چند ایمان پرور اشعار کو راقم اس شذرہ کا اختتامیہ بنا رہا ہے۔ اس یاد داشت کے ذریعے اس امر کو خاطر نشین کرنا تھا کہ سید مرحوم و مغفور عالم ادب ہی نہ تھے، ادب کی اداؤں کو صفحہ قرطاس پر منتقل بھی کر سکتے تھے :

,,کاروان حجاز میں.... وہ لکھتے نہیں دکھائی دیتے ہیں بلکہ جن لوگوں کو ان کی صحبت میں ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا ہے، ان کو ان کے پڑھنے میں محسوس ہوگا کہ وہ بول رہے ہیں اور لوگ ان کو سن رہے ہیں۔ انہوں نے پورا سفرنامہ بہت ہی والہانہ انداز میں لکھا ہے۔ جب وہ حرم شریف پہنچے تو فجر کی نماز کے لئے اذان ہوئی۔ ان کو اس میں بڑی دلکشی محسوس ہوئی۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ ابوقبیس کی چوٹیوں پر سپیدہ سحر کے آثار کا آغاز ہو رہا تھا۔ حرم کے درودیوار میں ان کو بجلیاں نظر آئیں۔ بیت اللہ کی جلالت شان اور سیاہ غلاف کے سکوت کا باوقار منظر ان کے لئے جنت نگاہ بن گیا۔ اس وقت بہت سے اشعار قلم بند کرتے جن میں سے کچھ۔ یہ ہیں :

حرم میں اذان سحر اللہ اللہ

کہ ہیں وجد میں بام و در اللہ اللہ

یہ میزاب رحمت، وہ رکن یمانی

مقامات اہل خبر اللہ اللہ

دھڑکتے ہوئے دل کا لے کر سہارا

مناجات باچشم تر اللہ اللہ

تجلی میں دھوئے ہوئے سنگریزے

یہاں کے نجوم و قمر اللہ اللہ

مقام براہیم پر یہ نمازیں

بہ ہر سجدہ معراج سر اللہ اللہ

جلال الہی کی تابندگی میں
 جھلکتے ہوئے بام و در اللہ اللہ
 وہ کعبہ جسے دیکھ لینا عبادت
 مسلسل ہے پیش نظر اللہ اللہ،

(ص ۲۸۳)

مصادر اور اشارات

- ۱۔ اقبال کے ہاں خواجہ بدر، حضرت سرور کائنات ہیں۔ جاوید نامہ (آنسوئے افلاک) سلطان شہید ٹیپو کے بارے میں فرماتے ہیں :
- از نگاہ خواجہ بدر و حنین فقر سلطان وارث جذب حسین
- ۲۔ دیکھنے راقم کا مقالہ سہ ماہی،، اقبال، لاہور : امیر خسرو کی نثر و نظم کا ایک جائزہ (انگریزی) جولائی ۱۹۷۶ء صفحہ ۲۷ تا ۵۸۔
- ۳۔ مجلہ دانش اسلام آباد خزاں ۱۹۸۷ء، ابتدائی ۳۰ صفحے
- ۴۔ اصل لفظ س ج ز (سجڑ) ہے۔ سجستان اور سگستان، ستان کے ہی نام ہیں۔
- ۵۔ ملاحظہ ہو غالب کے دیوان فارسی مطبوعہ ۱۸۶۲ء کا دیباچہ
- ۶۔ مجلہ دانش، حوالہ ۳ بالا صفحہ ۲۱۔
- ۷۔ علمی حلقے ان کو ایسا ہی سمجھتے رہے ہیں۔
- ۸۔ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی اور ڈاکٹر محمد ریاض سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۳ء ص ۱۹۰، ۱۹۱۔
- ۹۔ یہ بات مولانا سید صباح الدین یوں ہی لکھ گئے ہیں۔
- ۱۰۔ ضرب کلیم، کلیات اقبال اردو، لاہور ۱۹۷۳ء، صفحہ ۳۹۶، ۳۹۷۔
- ۱۱۔ بال جبریل، ایضاً صفحہ ۳۰۵۔
- ۱۲۔ ضرب کلیم، ایضاً صفحہ ۳۹۳۔
- ۱۳۔ پورا بند یوں ہے :
- تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے نشہ منے کو تعلق نہیں پیمانے سے
 ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کھمے کو صنم خانے سے
 کشنی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے عصر نورات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے
- ۱۴۔ منے لالہ فام، ڈاکٹر جاوید اقبال کے مضامین اور تقاریر کا مجموعہ ہے جو کئی بار شائع ہوا ہے۔
- ۱۵۔ یہ مصرع بال جبریل کی نظم :،، جاوید،، سے ہے (ص ۱۱۷ - ۲۰۹)۔ پورا شعر یوں ہے :
 ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ



© rasailojaraid.com